

حسنی جمال کا عکس جمیل

ممتاز استاذ و مربی و صاحب نظر عالم دین حضرت
مولانا ذوالفقار احمد صاحبؒ، سابق شیخ الحدیث
جامعہ فلاح دارین ترکیسر، گجرات کے مختصر حالات۔

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

مفتی محمد جنید فلاحی

پیش لفظ

دارالعلوم ماٹلی والا گجرات میں اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا) کا ساتواں فقہی سیمینار ۱۹۹۵ء میں منعقد ہو رہا تھا، اس پروگرام کی نسبت سے پہلی بار اس حقیر کا گجرات کا سفر ہوا، سیمینار سے دو دنوں پہلے ہی وہاں پہنچنا ہوا اور علاقہ کے اہم مدارس میں جانے کا موقع ملا، انھیں درسگاہوں میں ایک جامعہ فلاح دارین ترکیسر (گجرات) بھی ہے، یہاں جب حاضری ہوئی تو دو بزرگوں کو موجود پایا، ایک حضرت مولانا ابرار احمد صاحب دھولیویؒ، جو اس وقت جامعہ ہذا کے شیخ الحدیث تھے افسوس کہ پچاس سال سے کچھ اوپر عمر میں ہی ان کی وفات ہو گئی، دوسرے بزرگ ان سے بھی زیادہ سیدھے سادھے، گفتگو میں محتاط، لب و لہجہ میں نرم، کھلا ہوا رنگ؛ لیکن چہرہ پر چپک کے نشانات اور ہاتھ میں تسبیح، بڑی محبت و شفقت سے ملے اور چائے سے ضیافت فرمائی، یہ تھے حضرت مولانا ذوالفقار احمد صاحبؒ اور یہ تھی ان سے پہلی ملاقات، اس ملاقات میں کچھ زیادہ گفتگو نہیں ہوئی۔

اس کے کچھ عرصہ بعد جامعہ کے استاذ ادب مولانا محمد حبیب الرحمن ندوی حیدر آباد تشریف لائے اور جامعہ کے ذمہ داروں کی طرف سے مجھے فلاح دارین میں محاضرہ اور طلبہ کے سالانہ پروگرام کی صدارت کی دعوت دی، یہ حقیر حاضر ہوا ”جدید مسائل اور ان کا حل“ پر محاضرہ ہوا اور اگلے دن جامعہ کے پروگرام میں خطاب۔ حضرت مولانا ذوالفقار احمد صاحب اس وقت جامعہ کے شیخ الحدیث تھے، وہ ان دنوں پروگراموں میں شریک رہے، مجھے خود ان کی اس خور دنوازی سے شرمندگی ہوتی تھی؛ لیکن انھوں نے نہ صرف دونوں خطاب میں شروع سے آخر تک شرکت فرمائی؛ بلکہ اخیر میں دُعا کرانے سے

پہلے بے حد محبت کے الفاظ بھی کہے، میرے لئے ان کا یہ مشفقانہ برتاؤ صرف مسرت ہی کا باعث نہیں تھا؛ بلکہ ایک سبق بھی تھا کہ بڑوں کو اپنے چھوٹوں کے ساتھ کس طرح کا برتاؤ کرنا چاہئے۔

مولانا نے غالباً اگلے ہی سال اپنے فرزند ارجمند مولانا محمد جنید فلاحی سلمہ کو میرے پاس بھیجا، میں اس وقت جس مدرسہ میں خدمت کرتا تھا، وہاں وہ وقت داخلہ کا نہیں تھا اور میں خلاف ضابطہ کام سے حتی المقدور بچنے کی کوشش کرتا ہوں، اس لئے میں بہت پریشان ہوا اور مولانا سے صورتحال عرض کی کہ اب داخلہ کا وقت نہیں رہا، مولانا نے فرمایا کہ میں نے اسے مدرسہ میں داخلہ کے لئے نہیں بھیجا، آپ کی صحبت میں رہنے کے لئے بھیجا ہے، اس لئے چاہتا ہوں کہ آپ کے ساتھ رہے؛ چنانچہ عزیزِ سلمہ بڑی سعادت مندی کے ساتھ چھ سات ماہ اس حقیر کے ساتھ رہے اور میں جو علمی کام ان کے حوالہ کرتا رہا، تندرہی کے ساتھ اسے انجام دیتے رہے، ان کو تو شاید مجھ سے کچھ زیادہ فائدہ نہیں پہنچا؛ لیکن مجھے بڑا نفع یہ ہوا کہ ایک بزرگ یعنی ان کے والد ماجد کی شفقت و محبت اور بڑھ گئی اور حسن ظن میں بھی اضافہ ہوا، یہی ہمارے لئے بڑی متاع گرانمایہ ہے۔

چنانچہ جب معہد کا قیام عمل میں آیا تو ہم نے اپنے کچھ بزرگوں کو دُعا کے لئے خطوط لکھے، سیدی و سندی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے بہ شمول اکثر اکابر علماء کے حوصلہ افزاء جوابات وصول ہوئے، ان خطوط نے حوصلہ بڑھایا، ان ہی میں ایک مکتوب حضرت مولانا ذوالفقار احمد صاحبؒ کا تھا، اس گرامی نامہ میں ایک ایسی بات تھی، جس کو ایک بالغ نظر، زمانہ شناس اور تجربہ کار شخص ہی لکھ سکتا تھا، مولانا نے معہد کے قیام پر مسرت کا اظہار کرتے ہوئے جو کچھ لکھا، اس کا خلاصہ یہ تھا کہ :

یہ بات بہت بہتر ہے کہ آپ نے اس کو اپنے زیر اہتمام قائم

کیا ہے اور آئندہ بھی اس کو اپنے ہی زیر انتظام رکھیں؛ تاکہ اس ادارہ میں علم و تحقیق کے کام کی طرف اولین توجہ باقی رہے اور تعمیرات وغیرہ کو مقصد نہ بنالیا جائے۔

مولانا کی اس بات نے میرے دل کا غبار دھودیا؛ کیوں کہ میں اندر سے سخت تذبذب کا شکار تھا اور سوچتا تھا کہ کہیں انتظام و انصرام کی ذمہ داریاں مجھے علمی کاموں سے دور نہ کر دیں اور اس ادارہ کا قیام فائدہ کی بجائے نقصان کا سبب نہ بن جائے، پھر معہد کے قیام کے بعد سے ہی مولانا فلاح دارین کے ممتاز فضلا کو معہد میں مزید کسب علم کا مشورہ دیا کرتے تھے، اسی لئے اب تک تقریباً ہر سال ہی معہد میں وہاں کے ایک دو فضلا کا داخلہ ہوتا رہا ہے۔

۲۰۰۲ء میں جب اسلامک فقہ اکیڈمی کے بانی و ذمہ دار حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ کی وفات کے بعد ایک نئے انتظامی ڈھانچے کی تشکیل عمل میں آئی اور بزرگوں نے جنرل سکریٹری کی ذمہ داری اس حقیر سے متعلق کی تو اس وقت اکیڈمی کے خلاف غلط فہمیوں کی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں اور گجرات کے بھی بہت سے علماء اس سے متاثر تھے؛ چنانچہ راقم الحروف نے ذمہ داری سنبھالنے کے بعد اکیڈمی کے صدر حضرت مولانا مفتی محمد ظفیر الدین صاحب اور نائب صدر حضرت مولانا محمد برہان الدین صاحب کی قیادت میں ایک وفد کے ساتھ دیوبند اور سہارنپور کا سفر کیا، پھر اکیڈمی کے رکن حضرت مولانا محمد احمد دیولوی (مہتمم جامعہ علوم القرآن جمبوسر) کے ساتھ پورے گجرات کا سفر کیا، یہ اسفار اپنے مقصد کے اعتبار سے بڑے کامیاب رہے، اس سلسلہ میں راقم الحروف کی حاضری فلاح دارین ترکیسر میں بھی ہوئی، یہاں مولانا نے تمام اساتذہ کو جمع فرمایا، ان دنوں اتفاق سے مولانا محمد خلیل وارت صاحب بھی آئے ہوئے تھے، وہ بھی شریک رہے اور مجھ سے خطاب کرنے کی خواہش فرمائی، میں نے اکیڈمی کے قیام کا پس منظر، اکیڈمی کا طریقہ کار اور اس

کے فقہی سیمینار وغیرہ پر تفصیل سے گفتگو کی اور سوالات کے جواب بھی دیئے، مولانا نے پوری بات توجہ سے سماعت فرمائی اور پھر اس کی بھرپور تائید و تحسین بھی کی۔

مولانا کی شفقت، ان کے عوامی اثرات اور ان کی انتظامی لیاقت کا ایک خوشگوار تجربہ اکیڈمی کے سولہویں سیمینار منعقدہ برہان پور میں ہوا، یہ سیمینار مولانا کی ریاست مدھیہ پردیش میں ہو رہا تھا اور اس کی دعوت دینے والوں میں محبی فی اللہ مولانا محمد رحمت اللہ قاسمی اور عزیز الاعز مولانا محمد جنید فلاحی سلمہ پیش پیش تھے، یہ سیمینار اپنے حسن انتظام کے اعتبار سے گذشتہ سیمیناروں پر فائق تھا، جس میں مولانا کی سرپرستی اور ان کے اثرات کا بڑا دخل تھا، اس موقع سے مولانا نے خطبہ استقبالیہ پیش فرمایا، یہ خطبہ نہ صرف علمی، تاریخی بلکہ ادبی حیثیت سے بھی ایک شاہکار تھا، جسے بے حد پسند کیا گیا اور ہر طرف سے تحسین و آفریں کی صدا بلند ہونے لگی، مولانا کے تدریسی کمالات کا علم تو پہلے سے تھا، اس موقع سے پہلی بار آپ کے بلند ادبی ذوق کا بھی اندازہ ہوا۔

مولانا سے آخری ملاقات اکیڈمی کے ۱۹ ویں فقہی سیمینار (منعقدہ: ۱۲-۱۵ افروری ۲۰۱۰ء) کی مناسبت سے ہونے والے سفر گجرات میں ہوئی، اس سفر میں یہ حقیر جامعہ تعلیم الدین ڈابھیل سے ہوتے ہوئے فلاح دارین ترکیسر پہنچا، حسن اتفاق کہ حضرت مولانا عبد اللہ کا پودروی بھی موجود تھے، حسب معمول حضرت مولانا ذوالفقار صاحب کی شفقت اور بے کراں خور دنوازی سے شرمندہ ہوتا رہا، بعد نماز مغرب جامعہ کی مسجد میں اس حقیر کا خطاب رکھا گیا، خطاب سے پہلے میرے تعارف کے لئے مولانا خود مانک پر تشریف لائے، میں نے عرض کیا کہ آپ اس کی زحمت نہ فرمائیں، جامعہ میں میرے بھی متعدد شاگرد ہیں، ان میں سے کسی سے تعارف کروادیں، اگر ضرورت محسوس کریں، مگر مولانا نے

ایک نہ سنی اور فرمایا کہ میں خود تعارف کراؤں گا، پھر تعارف میں بھی بے حد حسن ظن کا اظہار فرمایا، میں نے اپنی تقریر شروع کرنے سے پہلے درخواست کی کہ آپ آرام کے لئے تشریف لے جائیں، مگر میری عزت افزائی کے لئے مولانا شروع سے آخر تک بیٹھے رہے، واقعہ ہے کہ مولانا کے اندر خوردنوازی اور چھوٹوں کے ساتھ شفقت کی جو کیفیت دیکھی، شاید اس درجہ کے کسی اور عالم میں نہیں دیکھی۔

مولانا کو اللہ تعالیٰ نے غیر معمولی تدریسی صلاحیت، سلیقہ تربیت اور شفقت و حوصلہ افزائی کے وافر جذبہ سے نوازا تھا، اس کا اندازہ مجھے ان کے شاگردوں سے مل کر ہوا، اولاد کو اپنے والدین سے فطری محبت ہوتی ہے، اس لئے سعادت مند اولاد بہر صورت اپنے ماں باپ کی تعریف کرتی ہے، مرید اپنے شیخ کو صرف عقیدت کی آنکھوں سے دیکھتا ہے، وہ تنقید کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر ہی اس کو چہ میں قدم رکھتا ہے؛ لیکن شاگرد کا معاملہ اپنے استاذ کے ساتھ یہ نہیں ہوتا؛ کیوں کہ آنکھیں بند کر کے علم و تحقیق کی وادیاں طے نہیں کی جاسکتیں، اسی لئے جب ایک شاگرد اپنے استاذ کا ثنا خواں ہوتا ہے تو اس میں کم ہی مبالغہ ہوتا ہے، مولانا کے شاگرد کو میں نے ان کا مداح اور بے حد معترف پایا، وہ ان کی تدریس سے بھی متاثر تھے، تربیت سے بھی اور خاص طور پر ان کے حسن اخلاق اور حسن سلوک سے بھی؛ اس لئے میرے دل میں مولانا کے لئے بڑی محبت و عقیدت کا جذبہ تھا۔

وہ نجیب الطرفین سادات میں تھے، ایک متدین اور دین اور علم دین سے محبت رکھنے والے گھرانے میں آنکھیں کھولیں، کم عمری میں، والدہ اور بہن کی شفقت سے محروم ہو گئے، اس شکستہ دلی اور بے سہارگی کے تجربہ نے انھیں شفقت و محبت اور صبر و تحمل کا پیکر بنا دیا تھا، دیوبند سے تعلیم مکمل فرمائی، مولانا حسین احمد مدنی کی خصوصی شفقتیں انھیں حاصل تھیں، وہ

۱۴ دسمبر ۱۹۴۰ء کو نور میں پیدا ہوئے، اور ۱۹۶۱ء میں دارالعلوم دیوبند سے فراغت حاصل کی، ابھی طالب علمی کا مرحلہ طے ہی ہوا تھا کہ دیوبند میں جامعہ فلاح دارین ترکیسر کی طرف سے پروانہ تدریس آگیا اور حضرت مولانا عبد اللہ کا پودروی کی نگاہ جو ہر شناس نے آپکڑا، وہیں سے ترکیسر کے لئے عازم سفر ہوئے، یہاں تک کہ ۴۳ سال اسلامی علوم کا درس دیتے ہوئے ۵ اپریل ۲۰۱۰ء کو عالم بقاء کی طرف رخصت ہوئے، اس دوران متوسطات سے لے کر بخاری شریف تک درس نظامی کی اکثر کتابوں کا درس دیا، بیرونی ممالک سے بھی مطالبہ آیا مگر پائے استقامت میں کوئی لرزش پیدا نہ ہوئی، اس حقیر کو وفات کے بعد ایک گھنٹہ کے اندر ہی اطلاع مل گئی تھی اور علالت کی اطلاع پہلے سے تھی، ایسا رنج ہوا جو اپنے کسی بزرگ خاندان کی وفات پر ہو سکتا ہے، خاص کر صاحبزادہ ارجمند عزیز ی الاغز مفتی محمد جنید فلاحی — بارک اللہ فی حیاتہ و خدماتہ و نفع بہ المسلمین — کے خیال نے بے چین کر دیا اور فون پر مسلسل کوشش کے باوجود اس وقت ان سے ربط نہ ہو سکا۔

راقم الحروف اس حادثہ کے کچھ ہی عرصہ بعد برطانیہ کے سفر پر گیا، وہاں مولانا کے متعلقین و مستفیدین نے ایک خصوصی پروگرام مولانا کی شخصیت پر رکھا، جن میں سرفہرست مولانا بشیر احمد خان پوری (سابق نائب مہتمم جامعہ فلاح دارین) تھے، ان کے علاوہ مولانا کے بعض رفقاء اور اکثر تلامذہ شریک تھے، میں نے اپنے خطاب میں تجویز پیش کی کہ آپ حضرات مولانا کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر مضامین کا مجموعہ مرتب کریں اور مولانا کی تحریروں کو بھی یکجا کریں، دل میں بار بار دعا یہ پیدا ہوتا رہا کہ کاش! مولانا کی حیات پر کوئی مختصر یا تفصیلی تحریر بروقت آجاتی، کہ اسی درمیان عزیز گرامی قدر مولانا محمد جنید فلاحی سلمہ کا مقالہ بلکہ رسالہ پہنچا، اس سے بڑی خوشی ہوئی اور ایک ہی مجلس میں پورا رسالہ پڑھ گیا، اب ایک سعادت سمجھ کر اس رسالہ پر یہ سطوریں لکھ رہا ہوں،

یہ رسالہ اپنے اختصار کے ساتھ صاحب تذکرہ کے حالات میں سے مؤلف کے حسن انتخاب کا مظہر ہے، اُمید ہے کہ وہ اس ”متن“ کی شرح بھی لکھیں گے اور اپنے والد ماجد پر تفصیل سے قلم اٹھائیں گے، یہی توقع ان کی روحانی اولاد یعنی دنیا بھر میں پھیلے ہوئے ان کے بے شمار شاگردوں سے بھی ہے۔ واللہ ولی التوفیق۔

واقعہ ہے کہ حضرت مولانا ذوالفقار احمد صاحب نہایت کامیاب مدرس، مخلص مربی، شخصیت کی تعمیر میں مہارت کے حامل، بلند اخلاق، بلند نگاہ، محبت و شفقت کے پیکر، صاحب ذوق اور صاحب قلم عالم دین، استاذ، داعی اور مربی تھے اور ان سے استفادہ کرنے والے طلبہ ان کے اندر باپ کی شفقت اور ماں کی ممتا کو اس طرح پاتے تھے کہ گھر کی جدائی کا احساس کم ہو جایا کرتا تھا، اس لئے ان کی پاکیزہ اور مثالی زندگی پر مرتب ہونے والی یہ تحریر یوں تو تمام ہی لوگوں کے لئے مفید ہے؛ لیکن خاص طور پر علماء اور دینی درسگاہوں کے لئے تو چشم کشا ہے، وہ اس آئینہ میں اپنی تصویر دیکھ سکتے ہیں، اور صاحب تذکرہ کی زندگی سے سبق حاصل کر سکتے ہیں کہ ایک کامیاب استاذ، مقبول معلم اور بانی فیض مربی کی زندگی کیسی ہونی چاہئے۔ دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ صاحب تذکرہ کی طویل دینی و علمی خدمات کو قبول فرمائے اور نئی نسل کو ان کے نقش قدم پر چلنے کا حوصلہ بخشنے۔ آمین

خالد سیف اللہ رحمانی

۲۵/ربیع الثانی ۱۴۳۱ھ

(ناظم المعهد العالی الاسلامی حیدرآباد)

۸ جولائی ۲۰۱۰ء

☆☆☆

حسنی جمال کا عکس جمیل

غالباً حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیریؒ کے تعزیتی اجلاس میں علامہ اقبالؒ نے یہ شعر پڑھا تھا :

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا
ڈاکٹر راحت اندوری فرماتے ہیں کہ نرگس ایک پھول ہے، جو عامۃً پورا نہیں کھلتا
اور جب مرجھاتا ہے تو اس میں سے پانی نکلتا ہے، برسوں میں کبھی کوئی پھول پورا کھل جاتا
ہے تو وہ ایک بڑی آنکھ کی شکل اختیار کر لیتا ہے، اسی سے آنکھ کی ایک صفت نرگسی ہونا ماخوذ
ہے۔

انسان تو دنیا میں بہت آتے اور چلے جاتے ہیں، انسان میں جتنی صفات خیر اللہ
رب العزت نے ودیعت فرمائی ہیں، ان سب کا صفات شر پر غالب ہو کر اس کے پیکر میں
جلوہ گر ہونا اور پوری آب و تاب کے ساتھ تادم حیات اسی حال میں باقی رہنا خال خال ہوتا
ہے، کہ شہرت، عزت، دولت، مرض، صحت، موسم، بادِ موافق اور بادِ مخالف کا کسی انسان کی
صفات حسنہ پر کوئی اثر نہ ہو، ایک ہی طرز و انداز باقی رہے :

اِس سعادَت بزوَر بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

اس بخشش میں اس کی کس نفسی کا بہت بڑا دخل ہوتا ہے، جیسا کہ ارشاد نبوی ہے :

مَنْ تَوَاضَعَ لِلَّهِ رَفَعَهُ اللَّهُ .

جو اللہ کے لئے تواضع اختیار کرتا ہے، اللہ اس کو بلند کرتے ہیں۔

”رفعہ اللہ“ کی شرح میں بعض شارحین حدیث نے ”وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ“ سے مدد لی ہے، جو کس نفسی کی شان پیدا کر لیتا ہے، اللہ اسے ان صفات حمیدہ سے دائمی طور پر آراستہ فرماتے ہیں، جو چہار دانگ عالم میں انسانی قلوب میں اسے بلند مقام دلاتی ہیں۔
— اس میں اس کے خاندانی بزرگوں کی صالحیت، نیکو کاری، عبادت، انسان دوستی، علم و اہل علم کے ادب اور محبت کا بھی بڑا اثر ہوتا ہے۔

علامہ ابن خلدون نے کسی جگہ لکھا ہے کہ ایک شخص کی نیکو کاری کا اثر اس کی پانچ نسلوں تک چلتا ہے، یعنی مسلسل نیکو کار پیدا ہوتے رہتے ہیں اور ”بادب، بانصیب“ مشہور مثل ہے، جس کے یہاں جتنی عقیدت و محبت اور ادب کا سرمایہ ہوتا ہے، وہ اسی لحاظ سے خیر کی باتوں میں بقاء و دوام پاتا ہے۔

شکستہ دلی کا بھی اثر ہوتا ہے ٹوٹے دل پر رب کائنات کی خصوصی نگاہ لطف و کرم رہتی ہے، اسی لطف و عطا کا نظارہ علامہ اقبالؒ کی حکیم نگاہ نے کیا توڑ پ کے بولے :

تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے ، ترا آئینہ ہے وہ آئینہ
کہ شکستہ گر ہو تو عزیز تر ہے نگاہ آئینہ ساز میں

’نگاہ آئینہ ساز‘ میں یہ ٹوٹا ہوا انسان کا دل جو غیر اللہ کے مراحم سے خالی؛ بلکہ مراحم کی اُمید سے بھی خالی ہوتا ہے، مہبط رحمت الہی بن جاتا ہے، یقیناً یہ بڑی نعمت ہی تھی: اسی لئے رب ذوالجلال نے اپنے محبوب ذوالکمال صلی اللہ علیہ وسلم کو بچپن ہی میں شکستہ دلی عطا فرمادی تھی :

پیدا ہوئے تو باپ کا سایہ اٹھالیا
گھٹنوں چلے تو دادا عدم کو روانہ تھا
چلنے لگے تو مادر و عم ہو گئے جدا
ہر ایک سایہ سر سے اٹھتا ہی چلا گیا
سائے پسند آئے نہ پروردگار کو

بے سایہ کر دیا گیا اس سایہ دار کو
یہ شکستہ دلی پر رحمت الہی کی بارش تھی، جس نے عرب کے اس یتیم کو عالم کا ”در یتیم“ بنا دیا تھا۔

حضرت مولانا سید ذوالفقار احمد صاحب قاسمی زوری رحمۃ اللہ علیہ — جن کو ہم قبلہ والد صاحب کہتے ہوئے ناز کرتے تھے اور اب ہمارا وہ متاع ناز جاتا رہا — ان ہی میں ہیں، ان کی ابتدائی زندگی کے پس منظر کو ملحوظ رکھتے ہوئے انہیں میں آج کا ”در یتیم“ کہہ سکتا ہوں، وہ تیرہ سال کی عمر میں ماں کے سایہ عاطفت سے محروم ہو گئے تھے اور چودہ سال کی عمر میں اکلوتی بہن نے بھی بھائیوں کو بلکتا چھوڑ کر دار بقاء کی راہ لی تھی، یہ وہ ظاہری عوامل ہیں، جنہوں نے قبلہ والد صاحب کو شفتوں کا دیوتا، ہر دل عزیز محسن خاص و عام، بے سہاروں کے لئے ایک سایہ عاطفت، اسلامی فکر کا ترجمان، علم کا مرکز اور روحانیت کا پیکر بنا دیا تھا۔

آئیے قدرے تفصیل سے ان عوامل کا جائزہ لیں :

۱۸۵۸ء کی فیصلہ کن جنگ آزادی ناکامی پر منہج ہوئی اور بیرونی حکمرانوں کے غیظ و غضب اور سزائے دار و رسن کا عبرت ناک دور ترکہ میں چھوڑ گئی، ملک کا بیشتر علاقہ لہو کے سمندر میں غوطہ زنی کر رہا تھا اور ملک کی فضاء سبھی ہوئی تھی؛ لیکن دو طرف سے پہاڑ اور تیسری طرف سندھ ندی سے گھرے ہمارے اس قریہ ’نرور‘ میں مسلمان پرسکون زندگی گزار رہے تھے، نرور سے دس کلومیٹر کے فاصلہ پر ندی کنارے آدیواسیوں کا قریہ ’ایراوان‘ ہے، چاشت کا وقت تھا، دھوپ تیز ہو رہی تھی، ایک بوڑھا آدیواسی نرور کے زمیندار سادات کی حویلی کے سامنے باادب کھڑا ایک خبر دینے کے لئے بے چین تھا، جیسے ہی گھر کے بزرگ کا سامنا ہوا، اس نے عرض کیا: ہمارے گاؤں میں کل شام آپ کے ایک دھرم گرو آ گئے ہیں، ہم نے رات میں ان کی سیوا کی؛ لیکن وہ تو مہمان پرش (عظیم انسان) معلوم ہوتے ہیں،

آپ انھیں اپنے یہاں لے آئیں، یہ سنتے ہی سادات کی مثالی مہمان نوازی کا جذبہ جوش میں آگیا، فوراً لگی تیار کی گئی اور ان بزرگ سے ملاقات اور انھیں اپنے یہاں لانے کے لئے گھوڑے سڑک پر دوڑنے لگے، شام ہوتے ہوتے سادات کے اس گھر میں بہادر شاہ ظفر مرحوم کے خاندان کے ایک فرد — جو حافظ و عالم اور روحانی نسبتوں سے آراستہ تھے — قدم رنجہ فرماتے۔

تین روز تک ایک زمین دار خاندان جیسی میزبانی کر سکتا تھا، وہ کی گئی، تین روز بعد اس غیرت مند مہمان نے فرمایا کہ اسلام میں مہمانی تین روز ہے، گو حالات ابھی میرے لئے ناسازگار ہیں، ایسے وقت میں آپ نے مجھے پناہ دی ہے، آج میرے پاس آپ کی میزبانی کے جواب کے لئے ظاہری اسباب سے کچھ نہیں ہے؛ لیکن یہ میری غیرت کے خلاف ہے کہ میں اس طرح ایک طرفہ انتفاع کرو، میں حافظ قرآن ہوں، آپ اپنے گھر کا کوئی فرد مجھے دیں، جسے میں قرآن پاک حفظ کرا کے آپ کی عنایات کا بدلہ چکا سکوں؛ چنانچہ سب سے چھوٹے بھائی ولی محمد کو حفظ کے لئے ان کے حوالہ کر دیا گیا، میزبان کے شاہانہ مزاج اور اتنے بڑے احسان کو دیکھتے ہوئے فوری طور پر رہائش کے لئے آٹھ کمروں پر مشتمل پتھر کی ایک عمارت تیار کی گئی، جس سے متصل کنواں بنوایا گیا، نماز کے لئے مسجد بنوائی گئی، چہل قدمی کے لئے باغیچہ، جس میں علاقہ کے سبھی پھلوں کے درخت تھے، چاشت اور کبھی ظہر پڑھنے کے لئے الگ مسجد، غسل کے لئے چوکور دو منزلہ عمارت سے مزین تالاب بنایا گیا۔

اس طرح آٹھ سال رہ کر انھوں نے حفظ کلام پاک اور دیگر فارسی اور کچھ عربی کتابوں کی تکمیل کرائی، چونکہ وہ خود صاحب نسبت تھے؛ اس لئے نسبتیں بھی منتقل فرمائیں، آٹھ سال بعد جب انھوں نے واپسی کی خواہش کی تو چالیس افراد کے ساتھ — جن میں ان کے شاگرد رشید بھی شامل تھے — حج بیت اللہ کا سفر کرایا اور سامان سفر کے ساتھ ساتھ

تحائف کا بھی نظم کیا گیا، جو اس وقت کے خدام حرمین کو پہنچائے گئے، اسی سفر میں خدام حرم کی طرف سے غلاف کعبہ کا ایک گز لمبا ٹکڑا بطور جوابی تحفہ عنایت کیا گیا، جو آج تک اس خاندان میں بطور تبرک موجود ہے۔

حافظ قرآن کریم اور عالم دین متین کی اس قدر شناسی، خدمت اور ان کے ساتھ محبت و عقیدت ہی کا اثر ہے کہ تب سے آج تک نسلوں میں حفاظ و علماء اور اصحاب نسبت ہوتے چلے آئے ہیں، (اللہ تعالیٰ اس برکت کو دیر تک اور دور تک قائم و جاری رکھے، آمین)۔

وہ شاگرد رشید حاجی حافظ ولی محمد صاحب کہلائے، جو اس خاندان کی زور میں اقامت پذیری کے بعد پہلے اسم با مستی ولی گزرے ہیں، انھوں نے اپنے ہی قلعہ نما گھر میں ایک مدرسہ کی بنیاد ڈالی اور کئی لوگوں کو حفظ کرایا، خود صاحب اولاد نہیں تھے، بھائیوں کے درمیان صرف ایک بیٹی تھی تو اس بھائی کی بیٹی کو حافظہ بنایا، پھر اپنے نواسے ریاض احمد کو حفظ کرایا، فارسی میں مثنوی کی تکمیل کرائی، صاحب نسبت بنایا، مزید تعلیم کے لئے گوالیار سے آگے 'اٹا وہ' بھیجا، جہاں انھوں نے شرح وقایہ کی تکمیل کی، ہدایہ کے کچھ حصے پڑھے اور خاص طور پر فرائض کی تعلیم حاصل کی، والد صاحب کے وہ دادا یہی ہیں، جن کے بارے میں والد صاحب نے لکھا ہے کہ ان کی عبادت و ریاضت کو اگر میں نے اپنی آنکھوں سے نہ دیکھا ہوتا تو بزرگوں کی عبادتوں کے قدیم واقعات کو تسلیم کرنے میں تذبذب رہتا۔

والد صاحب کے والد بزرگوار حاجی حافظ مختار احمد صاحب جو اپنے والد کے بڑے بیٹے تھے، بچپن ہی میں والدہ کے سایہ عاطفت سے محروم ہو گئے، دادی نے پرورش کی اور وہ چوں کہ خود حافظہ تھیں، انھوں نے پوتے کو خود حفظ کلام اللہ کرایا اور وہ سب کچھ منتقل کر دیا جو انھوں نے اپنے چچا جان حاجی ولی محمد سے حاصل کیا تھا، ان کی ولادت یکم رمضان ۱۳۳۰ھ، مطابق ۱۴ اگست ۱۹۱۲ء کو اور وفات ۲۶ جمادی الثانی ۱۴۲۵ھ، مطابق ۱۳ اگست ۲۰۰۴ء کو ہوئی، حافظ مختار احمد صاحب پیشہ کے اعتبار سے ابتداءً ریاستی حکومت میں پیش کار

تھے؛ لیکن بڑے ذاکر و شاعری، کثرت تلاوت میں بے مثال، معمولات کے بہت پابند، علماء نواز، علم دوست، بزرگوں کی صحبت کے شیدائی اور بڑے باغ و بہار آدمی تھے، والد ماجد (حضرت مولانا ذوالفقار احمد صاحب) خود فرماتے تھے؛ ہم نے جب سے ہوش سنبھالا اپنے والد کو تہجد اور دیگر معمولات کا پابند پایا۔

ملازمت کی وجہ سے نرور سے چالیس کلومیٹر دور تحصیل کریرا میں مقیم تھے، جہاں ایک بیٹی کے بعد ۱۳/۱۲ یقعدہ، مطابق ۱۴/۱۲ دسمبر ۱۹۴۰ء بروز سنچر کو ایک سعادت مند بیٹا پیدا ہوا، والد بزرگوار نے اس کا نام ذوالفقار احمد رکھا، کچھ عرصہ بعد وطن واپسی ہوئی اور نرور ہی میں اقامت پذیر ہو گئے، دو خالائیں بھی اسی محلہ میں رہتی تھیں؛ اس لئے والدہ اور خالائوں کی پُرفشقت آغوش میں پرورش ہوتی رہی۔

چار سال کی عمر سے ناظرہ قرآن پاک پڑھنا شروع کیا، والد صاحب کے دادا حافظ ریاض احمد صاحب ایک حد تک عالم تھے اور فارسی زبان میں بہت مہارت رکھتے تھے، قرآن کریم کی تکمیل کے بعد ان سے اردو اور فارسی کی کتابیں پڑھیں، یہ سلسلہ ابھی جاری ہی تھا کہ ملک کے حالات نے ایک بڑی کروٹ لی، انگریزی اقتدار کی بساط اُلٹ گئی، ملک زبانی طور پر آزاد ہوا، تقسیم ہندو پاک کا ایک سیلاب بلا خیز آیا اور اس نے لاکھوں کی آبادی کو درہم برہم کر کے رکھ دیا، لاکھوں افراد بے گھر ہو گئے، ہزاروں اس حال میں دنیا سے سدھارے کہ گور و کفن بھی ان کی پردہ پوشی کے لئے نہ مل سکے، ایک ہو کا عالم تھا اور ہر طرف سراسیمگی پھیلی ہوئی تھی۔

گوالیار میں تعصب عروج پر تھا، شہر اس کے اطراف سے محلے کے محلے خالی ہو رہے تھے، نرور بھی اس صورت حال سے غیر متاثر نہ رہا اور میرے دادا جان یعنی حافظ مختار احمد صاحب نے اپنے چھوٹے سے خاندان جو ایک بیٹی اور تین بیٹوں — ذوالفقار احمد، اقبال احمد اور نومولود فرید احمد — پر مشتمل تھا، کو لے کر یہاں سے ریاست حیدر آباد ہجرت

کی (جو اس وقت آزاد ریاست تھی) اور اورنگ آباد آ کر قیام کیا۔ علاقہ کے حالات کچھ بہتر ہونے اور دیہات میں فرقہ وارانہ تناؤ کے اثرات کم ہونے پر والد صاحب کے بڑے ماموں ابراہیم صاحب مرحوم (جن کے باب میں والد صاحب فرماتے تھے کہ ہم نے بڑے ماموں میں خواجہ ابوطالب کی فدائیت کی جھلک دیکھی ہے) اپنی بہن اور بچوں کو والد صاحب کی نانیہال ”ملکھن“ لے آئے، جو نرور سے پچاس کلومیٹر پر تھا۔

کچھ ہی دن گزرے تھے کہ گاؤں کے بچوں میں خسرہ کی وبا پھیل گئی، جو اس دور میں ’چچک‘ کے نام سے ایک جان لیوا بیماری تھی، اس سے یہ نو وارد خانوادہ بھی متاثر ہوا اور حافظ مختار احمد صاحب کا دوسرا بیٹا خسرہ کے مرض میں مبتلا ہو کر چار پانچ ہی روز میں اس دنیا سے اس طرح چل بسا کہ پردیس میں مہاجرت کی زندگی گزارنے پر مجبور باپ نماز جنازہ بھی نہ پڑھ سکا، حالات کی شکار والدہ اس حادثہ سے جس قدر غمگین ہوں گی، اس کا اندازہ تو ایک ماں ہی کر سکتی ہے۔

جاں نثار بھائی محمد ابراہیم نے جوان سب کو یہاں سے لے کر آئے تھے، ڈھارس بندھائی، ابھی اس صدمہ سے ابھرنے بھی نہ پائے تھے کہ بڑے بیٹے ذوالفقار احمد کو بھی خسرہ کا مرض لاحق ہو گیا اور سات سال کا بچہ موت و حیات کی کشمکش کا شکار صد مات سے ٹوٹی ماں کی گود میں لیٹا ہوا تھا، ماموں پر اس بیماری کا بہت گہرا اثر تھا کہ بہنوئی کو میں کیا جواب دوں گا، میں اپنی ذمہ داری پر نیچے یہاں لے آیا تھا کہ ماموں رہیں گے، مغرب کا وقت ہوا چاہتا تھا، ماموں کا بھی ایک سات سال کا صحت مند بیٹا اپنی ماں کا پلو پکڑے کھڑا تھا، ماموں نے اسے گود میں اٹھایا اور بیمار ذوالفقار پر سے درد بھرے انداز میں اسے یہ کہتے ہوئے تین بار گزرا کہ اے اللہ! اگر تجھے ذوالفقار کی موت ہی منظور ہے تو میرے اس بیٹے کو اس کے بدلے میں اٹھا لے اور ذوالفقار کو ٹھیک کر دے، شاید یہ وقت مستجاب تھا، دُعا کچھ

ایسے سچے دل سے کی گئی کہ قبولیت کے در کھلتے چلے گئے، رات ہی اس لڑکے کو شدید بخار آیا اور تیسرے روز وہ جاں بحق ہو گیا اور اس کے انتقال کرتے ہی بہن کا بیٹا ذوالفقار ٹھیک ہونا شروع ہو گیا، دو تین روز میں وہ بالکل صحت مند تھا۔

والد صاحب کے چہرہ پر اس خسرہ کے نشانات تھے، فرماتے تھے یہ خسرہ کے نہیں اس قربانی کے نشانات ہیں، جن میں ہم نے ابوطالب کی جھلک دیکھی ہے، ۲۸ء میں دادا جی کی اورنگ آباد سے واپسی کے بعد ضرور مستقل قیام ہو گیا، دادا جی تحصیل میں پٹواری ہو گئے اور والد صاحب کو اسکول میں داخل کر دیا گیا، تعلیم جاری ہی تھی کہ ۵۵ء میں — جب والد صاحب تیرہ سال کچھ مہینے کے تھے — صدمات، حالات اور امراض سے چور والدہ نے بھری جوانی میں ہی بچوں کو اللہ کے حوالے چھوڑ آخرت کا سفر کیا۔

لڑکپن کی عمر میں اچانک ہونے والے اس حادثہ نے بچوں کو بے دم کر کے رکھ دیا تھا ابھی وہ ماں کی ممتا ہی کو رو نہیں پائے تھے کہ دوسرے سال ۵۶ء میں اکلوتی بہن نے ایک مہلک مرض میں بھائیوں کو اکیلا بلکتا چھوڑ کر موت کو گلے لگا لیا، اب گھر میں کوئی عورت نہیں تھی، ممتا کو ترستی آنکھیں بہن کا جنازہ دیکھ کر خون کے آنسو بہا رہی تھیں، گھر کھانے کو دوڑتا تھا، دنیا بے رنگ و بے مزہ ہو گئی تھی، والد صاحب کے دل پر یہی وہ زبردست چوٹ لگی تھی، جس نے انھیں شفقتوں کا دیوتا اور دریسر بنا دیا تھا۔

انھیں ہر بڑی بوڑھی کے پیکر میں ماں کی ممتا نظر آتی تھی اور ماں باپ کو چھوڑ کر آنے والے ہر بچے کے پیکر میں وہ اپنی اور اپنے چھوٹے بھائیوں کا درد پسری دیکھتے تھے، یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے ہر شاگرد بلکہ ہر متعلق کے لئے ایک مربی، ایک استاذ، ایک روحانی باپ، کے ساتھ ساتھ ایک ماں کی شفقت رکھتے تھے، ہزاروں آنکھیں آج اسی شفقت پر اشک بار ہیں، اندور میں ڈاکٹر آصف صاحب کی والدہ کے انتقال پر تعزیت کے لئے جانا ہوا، دیر تک روتے رہے، پھر فرمایا: ہماری ماں ہمیں بچپن میں چھوڑ کر اس دنیا سے رخصت ہو گئی تھیں،

جب بھی کسی کی ماں کے انتقال کی خبر سنتا ہوں مجھے اپنی ماں کی وفات یاد آتی ہے، گزشتہ سال اپنی والدہ کی طرف سے راجستھان میں ایک بھیڑ کی قربانی کرائی، فرمایا کہ اس پر بال بہت ہوتے ہیں میری ماں کو ثواب بہت ملے گا۔

حوادث کی اس گھنگھور گھٹا میں سنت الہی کے مطابق رحمت ربانی کا ہلال چکا اور یہیں سے ان کے ارتقاء کا باب کچھ اس طرح شروع ہوا، ۵۴ء سے والد گرامی کے دادا حاجی ریاض احمد صاحب نے انھیں دوبارہ فارسی پڑھانا شروع کر دیا تھا، کریم، پندنامہ، گلستاں، بوستاں، دیوان حافظ اور مثنوی کا کچھ حصہ ان حوادث میں بھی انھوں نے پڑھا دیا۔ ادھر ایک عالم ”فانی ہڑپال پوری“ یہاں بڑے مقبول واعظ کے طور پر تشریف لاتے تھے، دادا جان حافظ مختار احمد صاحب اپنی علم دوستی کی وجہ سے انھیں اپنے ہی گھر قیام کراتے، بڑی خدمت کرتے، بیانات کا نظم کرتے، اسی درمیان گوالیار کے ایک سفر کے دوران معلوم ہوا کہ حضرت مولانا حسین احمد مدنی آگرہ تشریف لا رہے ہیں، گوالیار سے آگرہ قریب تھا، دادا جان اپنے بعض ساتھیوں کے ساتھ نیاز مندانہ آگرہ حاضر ہوئے اور وہیں حضرت مدنی کے دست حق نواز پر بیعت کی، وداعی ملاقات کے وقت مصافحہ کرتے ہوئے حادثات سے چور تین لیسر بچوں کا والد اپنے شیخ کے سامنے پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا، دُعا کی درخواست کی :

ترے عشق میں کوہ غم اٹھا ہی لیا جو ہو سو ہو

عیش و نشاطِ زندگی بھلا ہی دیا جو ہو سو ہو

فرمانے والے حضرت مدنی تو صبر و استقلال کا ہمالہ تھے، حالات کو بغور سنا اور پھر فیصلہ کن انداز میں فرمایا: آپ ابھی اپنے بڑے بیٹے ذوالفقار کو دیوبند مدرسہ میں لا کر داخل کر دیں، دادا جان نے عرض کیا: ہمارے علاقہ میں اس طرح کا کوئی ماحول نہیں ہے، لوگ سمجھیں گے کہ ماں کے مرجانے کے بعد انھیں سنبھال نہ سکا تو یتیم خانہ میں چھوڑ آیا، اس

کے علاوہ دیوبند بہت بڑی جگہ ہے، میں دور دراز علاقہ کا فقیر، میرا بچہ وہاں کون داخل کرے گا اور اتنے بڑے بڑوں میں وہ کیسے رہے گا؟ ہم دیہاتی لوگ ہیں، بچہ اسکول میں آٹھویں جماعت میں پڑھتا ہے، آپ دُعا فرمادیں، حضرت مدنیؒ نے فرمایا: امتحان دلا کر دیوبند لے آؤ، داخلہ ہو جائے گا، آپ ہمارے مہمان رہیں گے، لوگوں کے کہنے سے نہ ڈرو، اللہ کے دین کے لئے وقف کردو، حضرتؒ نے اس کا عہد لیا اور ڈھیر ساری دُعا ئیں دے کر رخصت کیا، دادا جان نرورواپس آگئے اور دن رات اسی شش و پنج میں تھے کہ اب کیا کریں؟ سماج کا مقابلہ کر کے حضرت مدنیؒ کے حکم کی تعمیل کریں یا جو تعلیم جاری ہے جاری رہنے دیں؟؟

حضرت مدنیؒ آگرہ سے دیوبند تشریف لے گئے اور اس وقت کے دارالعلوم کے مہتمم حضرت قاری محمد طیب صاحبؒ سے فرمایا: دارالعلوم کے روزاول سے آج تک گوالیار کے علاقہ سے کوئی طالب علم نہیں آیا، اب ہم نے مختار احمد نامی ایک شخص کو اپنا بچہ لانے کے لئے کہا ہے، وہ دیوبند کی عظمت سے سہمے ہوئے ہیں، دیہات کے رہنے والے ہیں، آپ اس پتہ پر پیشگی منظوری نامہ ارسال کر دیں؛ تاکہ انھیں ہمت بھی ہو اور حوصلہ ملے۔

دادا جان اپنے کمرہ میں تحصیل کے کاغذات کھولے بیٹھے ہوئے تھے، اس درمیان ڈاکیہ نے ایک خط لا کر دیا، دارالعلوم کے لیٹریٹ پر دارالعلوم کے مہتمم کے دستخط سے مزین سعادت مند ذوالفقار احمد کے داخلہ کا پیشگی منظوری نامہ دیکھ کر ایک دیہات کے رہنے والے شخص کا دل خوشی سے لبریز ہو گیا، ڈبڈباتی آنکھوں سے پورا خط پڑھا اور اسی وقت بیٹے کو اللہ کے دین کے لئے وقف کرنے کا عزم مصمم کر لیا، والد صاحب فرماتے تھے آج بھی وہ خط ہمارے گھر میں محفوظ ہے، خدا کرے اس عاجز کی اس خط تک رسائی ہو، والد صاحب کو میٹرک کا امتحان دلا کر نتیجہ کا انتظار کئے بغیر ہی ۵۷ء میں دیوبند لے جایا گیا، جہاں دادا جان کے ساتھ وہ تین روز حضرت مدنیؒ کے مہمان رہے اور ان کی واپسی کے بعد بھی آٹھ روز تک

حضرت مدنیؒ کے دسترخوان کے خوشہ چیں رہے، جو یقیناً ان کے لئے بڑی سعادت تھی۔ دادا جان کے اس سفر کے رفیق میرے ایک نانا سید برکت علی مرحوم سناتے تھے کہ مجھے اچھی طرح یاد ہے، جب حافظ مختار احمد صاحبؒ ذوالفقار کو دیوبند میں چھوڑ کر واپسی کا مصافحہ حضرت مدنیؒ سے کر رہے تھے، حضرت مدنیؒ نے فرمایا: چھوڑ جاؤ، انشاء اللہ یہ بچہ پڑھے گا اور بڑا بنے گا، واقعی اس بچہ نے پڑھا اور اتنا پڑھا کہ ساری زندگی اسی میں گزار دی، مرض الوفات سے پہلے چار روز مسلسل حدیث و شروح حدیث کا مطالعہ کرتے رہے، دفنر تک نہ آئے، کسی کو کیا معلوم تھا کہ وہ اپنے حصہ کی پڑھائی کی تکمیل فرما رہے ہیں!

دیوبند میں داخلہ کے بعد آزمائشوں کا نیا دور شروع ہوا، دادا جان کی تنخواہ محدود، اسی میں گھر میں دو چھوٹے بھائی، گھر کا خرچ اور پھر والد صاحب کے اخراجات، محدود رقم ہی جاتی تھی، سال میں دو جوڑے کپڑے بنتے تھے، وہ بھی آخر میں اپنے انجام کو پہنچ جاتے، یہ معمول ساری زندگی رہا، دو جوڑے سے زیادہ نہ بنواتے، اگر کبھی بن جاتے تو اگلے سال ناغہ کرتے، داخلہ مستطیع کی حیثیت سے تھا، ادھر کتابیں خریدنے کا آبائی شوق تھا، فیس کے پیسے کتابوں کی نذر ہو جاتے تو چنے کھا کر گزارہ کرنے کی بھی نوبت آتی رہی۔

والد صاحبؒ نے چار سال فارسی اپنے دادا جان حافظ ریاض احمد صاحبؒ سے پڑھی تھی، اس لئے دارالعلوم میں ابتدائی درجات میں داخلہ کے باوجود جلد ہی اگلی کتابیں پڑھنے کا موقع مل گیا؛ چوں کہ اسکول سے ہندی، حساب وغیرہ پڑھ کر گئے تھے، وہاں جن استاد کے پاس ہندی، حساب کے اسباق تھے، انھوں نے یہ دیکھ کر کہ یہ اسکول سے پڑھ کر آیا ہے، فرمایا: میں اس گھنٹی میں اپنی تلاوت کیا کروں گا، تم جماعت کے طلبہ کو ہندی، حساب، پڑھا دیا کرو، اسی وجہ سے والد صاحبؒ کے ہم جماعت آپ کو ”گرو جی“ کہا کرتے تھے۔

ایک مرتبہ شدید گرمی میں گھر سے دیوبند کا سفر کیا، دوپہر کی چلچلاتی دھوپ میں دارالعلوم پہنچے کہ اچانک آنکھوں کی بینائی جاتی رہی، مدرسہ کا ایک طالب علم گھر سے مدرسہ

پہنچ کر اچانک بصارت کھو بیٹھے، اس پر کیا گزرے گی؟ لیکن حوصلہ شکن مصائب ہی کی چھاتی سے دودھ پی کر پروان چڑھنے والے لوگ عزم و بہمت کے ساتھ طوفانِ زندگی کا مقابلہ کرتے ہیں، آپ نے کچھ دیر بیٹھ کر سوچا اور پھر کمرہ کے ایک ساتھی کے سہارے حجام کے یہاں پہنچے، اس سے اس دور کے اصلی ٹھنڈے تیل کی دیر تک مالش کرائی، رحمت ایزدی شامل حال تھی، بصارت عود کرائی، جو گرمی کی شدت سے متاثر ہو گئی تھی۔

ایک دلچسپ واقعہ

تختانی درجات کے ایک معمر استاد جو حضرت مدنی سے وابستہ ہونے کی وجہ سے دادا جان سے علیک سلیک رکھتے تھے، والد صاحب نے ان کی بہت خدمت کی، خود فرماتے تھے: میں ان کی معذوری کے زمانے میں قارورہ پھینکا کرتا تھا اور روزانہ خدمت میں آنا جانا تھا۔ علاقہ سے ایک صاحب نے اپنا بچہ بھی دارالعلوم پڑھنے بھیج دیا تھا، ہم علاقہ ہونے کی وجہ سے وہ والد صاحب کے ساتھ رہتا، اس نے چوری کی، جس کا والد صاحب پر گہرا اثر ہوا، اس کا اخراج کیا گیا اور دورانِ تعلیم والد صاحب کو اسے گھر چھوڑنے آنا پڑا، کرایہ پاس نہیں تھا، سوچا اپنے مخدوم سے کرایہ کی مقدار تیرہ روپے قرض لے لیتے ہیں، واپسی پر ادا کر دیں گے، دوپہر کمرہ جا کر مخدوم سے عرض کیا: حضرت! تیرہ روپے قرض چاہئے، ایسے حالات پیش آگئے ہیں، واپسی پر ادا کر دیں گے، انھوں نے فرمایا: قرض چاہئے تو کاغذ قلم لاؤ، پہلے لکھو ”مجھے اس تاریخ کو اس دن اتنا قرض فلاں صاحب سے چاہئے اور فلاں تاریخ تک میں ادا کر دوں گا“۔

یہ جملہ ایک غیور شخص کے لئے بجلی کے جھٹکے سے کم نہیں تھا، دل مسوس کر رہ گئے، آنکھیں آبدیدہ ہو گئیں، مخدوم کا حکم تھا، لکھنا پڑا، پیسہ کی ادائیگی ہوئی اور سفر شروع ہو گیا، پہلے اس لڑے کو اپنے گھر پہنچایا، پھر خود گھر پہنچے اور فوراً دادا جان سے پیسہ لے کر اسی وقت مخدوم کے نام منی آرڈر کر دیا، دس روز بعد واپسی ہوئی، دوپہر کا کھانا لے کر مخدوم کے کمرہ

میں حاضری دی، سلام و دعاء کے بعد فرمایا: وہ قرض جو لیا تھا، واپس کرو، عرض کیا: حضرت! وہ تو ہم نے گھر پہنچتے ہی منی آرڈر سے بھیج دیا تھا، فرمایا: رسید دکھاؤ، رسید پاس نہ تھی، شرمندگی سے چہرہ زرد ہو رہا تھا، بہت محتاط آنسو آخر چھلک ہی پڑے، مخدوم نے فرمایا: بیٹے! تیرا مجھ سے جو تعلق ہے، یہ تیرہ روپے اس میں کوئی معنی نہیں رکھتے، میں نے اسی روز یہ نیت کر لی تھی کہ میں یہ پیسے واپس نہیں لوں گا؛ لیکن میں تو یہ دیکھ رہا تھا کہ دن رات قرآن و حدیث و فقہ پڑھنے والے قرآن کے احکام سے اتنے دور ہیں کہ اگر انھیں اس پر عمل کرایا جائے تو ان کو غیرت آتی ہے، قرآن میں تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَدَايَيْتُمْ بِدَيْنٍ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوهُ“ میں نے اسی پر تو عمل کرایا تھا؟ تجھے اتنا برا کیوں لگا؟ اس واقعہ کو وہ زندگی کے بڑے قیمتی سبق کے طور پر بار بار بیان فرماتے تھے۔

اس واقعہ نے ان کی زندگی میں کمال درجہ معاملات کی صفائی پیدا کر دی تھی، اگر کسی کا پیسہ باقی ہے تو وہ ایسے بے چین رہتے تھے گویا وہ بیمار ہے اور انھیں اس کی دوا پہنچانی ہے، پھر زندگی کا انھوں نے یہ ایک اصول بنالیا تھا کہ کبھی قرض نہیں لیتے تھے، گجرات میں اتنا لمبا عرصہ گزارا، زندگی کے اکثر ادوار جوانی سے وفات تک وہیں گزرے؛ لیکن قرض سے انھوں نے بہت اجتناب کیا، اپنے قریب ترین لوگوں سے بھی قرض لینے سے بچتے تھے، فرماتے تھے: ”القرض مقراض المحبة“ ادارہ سے ۴۳ سال وابستگی رہی؛ لیکن اس سے بھی کبھی قرض کے طور پر کوئی رقم نہیں لی۔

دورانِ تعلیم ایک مرتبہ رات میں تپائی پر دائیں ہاتھ کی کہنی رکھے ہوئے مطالعہ میں منہمک تھے، نیند کے شدید جھونکے سے کہنی زمین سے شدت کے ساتھ جا ٹکرائی، ابتداءً درد رہا، بڑھتے بڑھتے اس نے ایک مہلک مرض ہڈی کی ٹی بی کی شکل اختیار کر لی، اسی تکلیف میں مشکوٰۃ شریف کا امتحان دے کر گھر واپسی ہوئی، اطباء نے ایک سال مسلسل علاج اور آرام کا مشورہ دیا، اس طرح جس جماعت میں مشکوٰۃ شریف تک تعلیم ہوئی تھی، وہ ایک

سال پہلے فارغ ہو گئی، والد صاحبؒ نے دورہ حدیث ایک سال بعد آ کر مکمل کیا۔

دادا جان مدارس کی دنیا اور اس کی تعلیم سے یکسر نابلد تھے، ان کے رفقاء نے یہ بات ذہن نشین کرادی کہ اب اس مہلک مرض سے نجات کے بعد ذوالفقار احمد کو پڑھنے نہ بھیجیں ورنہ دوبارہ مریض ہو جائے گا، والد صاحبؒ کی زندگی میں یہ ایک ہی واقعہ ہے کہ انھیں دورہ حدیث شریف کی تکمیل کے لئے دادا جان کی رائے کے علی الرغم دیوبند جانا پڑا۔

دادا جان کی شدید ناراضگی کا اثر وہاں کی ضروریات کی تکمیل پر بھی پڑا؛ بہت تنگی میں سال گزرا، اس شیدائی حدیث نے علم حدیث کے لئے یہ سب کچھ خوشی خوشی برداشت کیا اور وقت گزرنے کے ساتھ تدریس کی ابتداء ہو جانے پر دادا جان کو بھی منامی لیا، اگر اس سے پہلے کوشش کرتے تو شاید اخراجات کی خاطر منانے کا شائبہ ہوتا جو اس غیور شیدائی حدیث کو گوارہ نہ تھا۔

دورانِ تعلیم ایم، پی کے اکابر علماء میں ان کا زیادہ تعلق سابق قاضی شہر بھوپال حضرت مولانا عابد علی وجدی الحسنى رحمۃ اللہ علیہ سے رہا، کئی سفر اور کئی کئی روز قیام صرف ان سے ملاقات و صحبت کے لئے ہوا، انھوں نے فقہ میں مہارت کی طرف توجہ دلائی، فراغت کے بعد افتاء کا بھی مشورہ دیا تھا؛ لیکن والد صاحبؒ کا رجحان ہر فن سے مناسبت رکھنے کا تھا، جسے بعد میں مستفیدین نے ضرور محسوس کیا ہوگا، وہی اس سے مانع بنا، ان کے اشارہ پر دورانِ تعلیم ہی والد صاحبؒ کو ایک مدرسہ کی شوریٰ میں شامل کر لیا گیا، تین چار مرتبہ شوریٰ کی مجالس میں دورانِ تعطیل شرکت ہوئی، ایک مرتبہ سخت سردی تھی، ٹھنڈے پانی سے طلبہ کے چہرے اور ہاتھ پیر پھٹ رہے تھے، ان کی حالت قابلِ رحم تھی، ایک مہمان آئے ہوئے تھے، ان کے سامنے شوریٰ کوئی تعمیری منصوبہ پیش کرنے جارہی تھی، والد صاحبؒ نے فرمایا: ان طلبہ کے لئے گرم پانی کا نظم پہلے ضروری ہے، طلبہ کی ضرورت و سہولت کو اولیت دی جانی چاہئے، اس مہمان نے بھی تائید کی، پس پھر کبھی وہاں سے شوریٰ میں شرکت کا دعوت نامہ نہ آیا،

والد صاحبؒ بعد میں کئی مدارس کے سرپرست اور بعض کی شوریٰ میں شامل رہے، سردی کے موسم میں جہاں طلبہ کی ایسی حالت پر نظر پڑتی تو اربابِ مدرسہ کو اپنا یہ واقعہ ضرور سنا دیتے۔

اس دور میں دارالعلوم کا شاید ہی کوئی طالب علم ایسا ہو جو حضرت مولانا انظر شاہ صاحبؒ کی طلاقت لسانی، انداز بیان میں ندرت، درسی نکات اور باغ و بہار طرزِ خطاب سے متاثر نہ ہو، والد صاحبؒ کو بھی حضرت شاہ صاحبؒ کی خصوصی شفقتیں اور بعض عادات کی وجہ سے اعتماد حاصل رہا، تعلیم کے زمانے میں وہ شاہ صاحبؒ کے بیان کی ہو بہو نقل کرتے تھے، بیان والد صاحبؒ کا ہوتا انداز شاہ صاحبؒ کا؛ لیکن زمانہ تدریس میں یہ وطیرہ باقی نہیں رکھا۔

۱۹۶۷ء میں دورہ حدیث شریف سے فراغت کے بعد تعلیم جاری رکھنے کا اشتیاق دوبارہ دیوبند لے گیا، ابھی کچھ ہی روز ہوئے تھے کہ ایک رات خواب دیکھا: کوئی کہہ رہا تھا کہ ذوالفقار گجرات میں ایک مدرسہ ہے، جسے ایک ہی شخص چلاتا ہے، وہ بلائیں تو چلے جاؤ اور وہیں کے ہو کر رہو — دوسرے روز دارالعلوم فلاح دارین کی اساس و بنیاد اور مہتمم حضرت مولانا عبداللہ صاحب کا پودروی دامت برکاتہم دیوبند پہنچے، جنھیں متوسطات کے لئے ایک ایسے استاذ کی ضرورت تھی، جو صلاحیت کے ساتھ ساتھ زبان و قلم کی صلاحیتوں سے آراستہ ہو، بعض اساتذہ اور طلبہ کی نشاندہی پر والد صاحبؒ تک رسائی ہوئی اور قاری اصغر علی صاحبؒ کے مکان میں حضرت مولانا ارشد مدنی صاحب دامت برکاتہم کی موجودگی میں دونوں کی ملاقات ہوئی، اپنے گزشتہ خواب اور مدنی خاندان کے اکرام میں اجنبی جگہ کے لئے اجنبی لوگوں سے ہونے والا معاہدہ بلا شرط تمام ہوا، متوکل مزاجی نے نہ کتاب کی بات ہونے دی نہ مشاہرہ کی، اور آج ہی نہیں تادم حیات کبھی اس پر زبان نہ کھلی، صرف اتنا عرض کیا کہ مجھے ایک بار گھر ہوانے دیں؛ لیکن مولانا عبداللہ صاحب کی ایما پر مولانا ارشد صاحب دامت برکاتہم کا حکم اس سے بھی مانع رہا اور مولانا عبداللہ صاحب کی معیت میں یہ غریب الوطن گجرات کا ایسا رہا، ہوا کہ پھر ۶ اپریل ۲۰۱۰ء کو جنازہ ہی گھر لوٹا۔

ان کی تحریر کے مطابق ۱۳ فروری ۱۹۶۷ء پیر کے روز ترکیسر میں حاضری ہوئی، ایک سو پچاس روپے مشاہرہ مقرر ہوا، شرح وقایہ و دیگر کتب کا درس متعلق ہوا، مدرسہ سے دور بازار میں ایک مکان رہائش کے لئے ملا، جس میں مسلسل سترہ سال تنہا مقیم رہے، اپنی وسعت کے مطابق تدریس کے ابتدائی زمانہ (۱۹۶۸ء) میں حسینی سادات کے خاندان میں اپنی حقیقی خالہ زاد بہن سے انتہائی سادگی کے ساتھ عقد نکاح کر کے ۱۹۵۴ء میں والدہ ماجدہ اور ہمشیرہ کے انتقال سے ویران شدہ گھر کو دوبارہ آباد کیا اور پھر اللہ کا شکر ہے کہ اس کا چراغ کبھی گل نہ ہوا، والد صاحب چھوٹے بھائی اور رشتے داروں کے لئے گھر کا دروازہ ہمیشہ کھلا رکھنے، آئندہ نسل اپنی آبائی تہذیب سے ہم آغوش رہے، اس کی خاطر کبھی اپنی شریک حیات کو گجرات منتقل نہ کیا، بہ صد استقلال تنہا ہر آزمائش کا مقابلہ کیا؛ حتیٰ کہ مرض الوفات سے بھی تنہائی میں ہم آغوش ہوئے اور فرقت ہی میں اپنے رب حقیقی سے جا ملے۔

’ترکیسر‘ آکر وہ تدریسی خدمات کے ساتھ ساتھ ہمیشہ ادارہ کے دیگر امور بھی انجام دیتے رہے، خود فرماتے تھے، میں امتحانات کے پرچے رات بھر بیٹھ کر لال ٹین کی روشنی میں کاربن پیپر لگا کر لکھتا تھا اور جاگتے جاگتے کبھی رونا آجاتا تھا، ہاتھ میں شدید درد ہوتا تھا؛ لیکن کبھی اظہار نہیں کیا، جلسوں کے لئے طلبہ کی اچھے مضامین پر مشتمل تقاریر کی تیاری، نفیس اور صحیح عقیدہ پر مشتمل بڑے شعراء کے نعتیہ کلام سے منتخب نعتیں، موقع محل کے لحاظ سے قرآنی آیات کے طغریے تیار کرانا، انھیں اسٹیج کی زینت بنانا، مغربی تہذیب و تمدن نے اسلام کے جن احکام کو ہدف بنایا ہے، ان سے موضوعات کا انتخاب کر کے طلبہ کے سیمینار منعقد کرنا، طلبہ میں تحریری ذوق پیدا کرنا، راتوں کو جاگ جاگ کر ان کے مقالات کی تصحیح کرنا، باصلاحیت طلبہ کو اس کے لئے ذہنی طور پر تیار کرنا، تقریری مقابلے کرنا، اس کے لئے تیاریاں کرنا، ان کے محبوب مشغلوں میں شامل تھا، سالانہ امتحانات کے بعد طلبہ میں مطالعہ کا ذوق پیدا کرنے کے لئے بہ طور انعام کتابیں تقسیم ہوتی تھیں، مختلف ناشرین کی فہرست

مطبوعات سے ہر درجہ کے طلبہ کی استعداد کے مطابق ان کے لئے کتب کا انتخاب کرنا، سالانہ جلسہ کی تیاریاں کرنا اور اسے ادارہ کی عزت بنا کر پیش کرنا، ہر سال سالانہ رپورٹ تیار کرنا، مہمانوں میں ادارہ کا تعارف کرانا، کہیں کوئی وفد ادارہ کی طرف سے جائے اور وہ شامل ہوں تو بہت ہی ذمہ دارانہ انداز میں ادارہ کی بھرپور ترجمانی کرنا، پوری دنیا میں فلاحی فارغین کے کاموں سے باخبر رہنا، انھیں مشورہ دینا، ان کے اداروں کی تحریری، زبانی، قانونی ضروریات پوری کرنا، ان کے کارناموں کو ادارہ کی خدمات کے طور پر پیش کرنا، انتظامیہ کو نیک، مخلصانہ اور قیمتی مشورہ دینا، تدریسی خدمات کے علاوہ یہ سب اور اس کے علاوہ بہت کچھ انھوں نے اپنے ذمہ کر رکھا تھا۔

ایک مرتبہ ایک سیمینار کے موقع پر علیل ہو گئے، دمہ کی ایک قسم بطور مرض لاحق تھی، ابتدائی سردی اور ابتدائی گرمی میں عموماً اس کا حملہ ہوتا اور تنفس کی وجہ سے کبھی کبھی پوری رات بیٹھ کر گزار دیتے؛ لیکن دن میں کسی کو احساس نہ ہونے دیتے، اس کا حملہ ہو گیا، ہم لوگوں کو بھی تشویش تھی، حدیث کے ایک بڑے استاد نے ازراہ محبت فرمایا کہ مولانا اتنی محنت کر کے کیوں زندگی اجیرن بنائے ہوئے ہو مر جاؤ گے تو کوئی یاد بھی نہیں کرے گا، گھر آ کر فرمانے لگے کہ تدریس کی تو تنخواہ لیتے ہیں، آخرت کے لئے بھی تو کچھ کرنا چاہئے۔

ایک مرتبہ عشاء کا وضو کر کے لال ٹین ہاتھ میں لئے غسل خانہ سے کمرہ میں تشریف لائے، ان کی تدریس کے دور کے قریبی دوست ملنے آ گئے، کہنے لگے: مولانا! آپ کے اتنے شاگرد لندن و افریقہ وغیرہ میں ہیں، جدید ٹارچ کیوں نہیں منگا لیتے؟ برجستہ فرمایا: قاری صاحب! ہم مانگتے نہیں آئے، پھر بیٹھ کر فرمایا: قاری صاحب! جو خود آجائے، وہ اللہ کی طرف سے ہے، مطالبہ کر لیا تو پھر اپنے اعمال کا اخروی اجر کہاں جائے گا؟

ابتدائی دور میں اساتذہ کے درمیان قلت مشاہرہ کا شکوہ ہوا اور بات یہ طے پائی کہ مشاہرہ میں اضافہ کی درخواست لکھ کر ذمہ داران اور خاص طور پر ”راوت برادران“ جو اس

ادارہ کی مکمل کفالت کرتے تھے، انھیں دی جائے؛ چنانچہ درخواست لکھی گئی اور اساتذہ نے اس پر اپنے دستخط فرمائے، والد صاحب نے انکار کرتے ہوئے فرمایا: یہ تو بندوں سے مطالبہ ہوا، ان کے ایک انتہائی مخلص دوست جو استاد حدیث بھی تھے، انھوں نے بھی دستخط نہیں کئے، جب درخواست پیش ہوئی تو درخواست گزاروں کے مشاہرہ میں اضافہ کر دیا گیا، یہ دونوں حضرات اپنے قدیم مشاہرہ پر رہ گئے۔

ایک سال سے زائد عرصہ گزرا، ہماری سب سے چھوٹی ہمشیرہ کی ولادت کا وقت تھا کہ ذمہ داران کی مجلس ہوئی اور مشاہرہ کا دفتر پیش ہوا، جس میں ان دو حضرات کا مشاہرہ سب سے کم تھا، کمی کی وجہ دریافت کی گئی تو بتایا گیا کہ انھوں نے اضافہ کی درخواست پر دستخط نہیں کئے تھے، حاجی یوسف صاحب نے فرمایا: جس روز سے ان سب کا اضافہ ہوا ہے، تب ہی سے ان دونوں حضرات کو بھی اضافی رقم ادا کی جائے، اس کی ادائیگی ہمشیرہ کی ولادت کے وقت ہوئی، فرماتے تھے کہ بچیاں گھر میں برکت کا ذریعہ ہوتی ہیں، یہ اس کی زندہ مثال ہے۔

ان کی اپنی ذاتی زندگی عجیب قلندرانہ تھی، دوسروں کو مشورہ دیتے وقت اسباب پیش نظر رہتے، اپنی ذات کے لئے معاملہ عجیب تھا، سب سے بڑے بیٹے سہیل احمد کی ولادت ۱۹۷۰ء میں ہوئی، اس وقت گھر کے حالات کے پیش نظر آپ نے ربیع الاول سے شعبان تک کی چھٹی منظور کرا لی، گھر تشریف لے آئے، کچھ روز قیام کر کے علاقہ میں پھیلی بے دینی کو قریب سے محسوس کیا اور تبلیغی جماعت کے احباب کے ساتھ مل کر ’نور‘ میں ایک اجتماع کیا، اس کے لئے دیہات دیہات کا سفر کیا، خدا داد صلاحیتوں سے بہترین انتظام فرمایا، یہ علاقہ کا تاریخی، کامیاب اور سب سے پہلا اجتماع مانا جاتا رہا، بستی والوں نے درخواست کی کہ آپ گھر میں مقیم رہتے ہیں، ہم چاہتے ہیں کہ بستی کے بچے آپ سے استفادہ کریں، آپ بستی کے کتب میں کچھ پڑھا دیا کریں، تین مہینے یہ خدمت بھی بحسن و خوبی انجام دی۔

اسی زمانے کا ایک واقعہ خود سناتے تھے کہ سہیل کی ولادت سے دو روز پہلے میری جیب میں صرف ایک روپیہ تھا، بارش شدید تھی، ظہر پڑھ کر گھر آیا تھا کہ بوڑھا شخص لکڑی کا گٹھ لے کر آیا اور کہنے لگا: اسے خرید لو! میرے پاس شام میں کھانے کو کچھ نہیں ہے، بارش ہو رہی ہے، میں کہاں جاؤں گا، ایک روپیہ دے دو میں آٹا خرید کر گھر لے جاؤں گا، والد صاحب فرماتے تھے کہ میں نے اس سے لکڑیاں لے لیں اور وہ ایک روپیہ اسے دے دیا اور دل میں سوچا اب اپنے پیارے اللہ کی مدد کیجیں گے، عصر کی نماز پڑھی باہر نکلے، محلے کے ایک صاحب آئے اور کہنے لگے کہ فلاں گاؤں میں آج رات آپ کا بیان ہے، انھوں نے مجھے مکلف کیا تھا، میں بھول گیا، اب ہمیں ابھی ہی چلنا ہے، والد صاحب نے گھر کے حالات کے تحت معذرت کی، انھوں نے کہا: میری عزت کا سوال ہے، میں نے وعدہ کیا تھا کہ میں لے کر آؤں گا، والد صاحب ان کے ساتھ ۳۵ کلومیٹر دور گاؤں کے لئے بس سے روانہ ہو گئے، رات بیان ہوا صبح سویرے واپسی ہوئی، فرماتے تھے، میں نے گھر آ کر کرتے کی جیب میں ہاتھ ڈالا تو بیس کا نوٹ تھا، میں فوراً رفیق سفر کے گھر کیا کہ رات دونوں کے کرتے ساتھ ساتھ رکھے تھے، ممکن ہے انھوں نے غلطی سے اپنے پیسے ڈال دیئے ہوں، انھوں نے کہا: وہ پیسے آپ ہی کے ہیں، فلاں صاحب ہدیہ دینا چاہتے تھے، ہاتھ میں دینے کی ہمت نہیں ہوئی، خاموشی سے جیب میں ڈال دیئے تھے اور کہا تھا کہ دریافت کرنے پر بتا دیں کہ ہدیہ ہے، واپس نہ کریں، مجھے تکلیف ہوگی، والد صاحب ازراہ مزاح فرماتے تھے کہ تب معلوم ہوا کہ ویسے اللہ ایک کے دس دیتے ہیں، بارش میں ایک کے بیس دیتے ہیں۔

فلاح دارین کی تدریس کے ابتدائی دور میں ایک موٹر ایسا بھی آیا کہ لندن سے ایک صاحب وہاں تدریس کی پیشکش لے کر حاضر ہوئے، وہ اتنے پر عزم تھے کہ ویزا اور ٹکٹ ساتھ لے کر آئے تھے، بے حد اصرار کیا کہ یہاں سے مستعفی ہو کر آپ ہمارے ساتھ چلیں، والد صاحب کے کئی رفقاء سے کہلایا، جب ادھر سے شدید انکار رہا تو انھوں نے مہتمم صاحب

(مولانا عبداللہ صاحب دامت برکاتہم) کو راضی کیا کہ آپ سفارش کریں، مولانا ذوالفقار صاحب آپ سے معاہدہ کی وجہ سے غالباً انکار کر رہے ہیں، مولانا نے والد صاحب سے بات کی کہ ان کا بہت اصرار ہے، وہاں شدید ضرورت ہے، یہاں تو لوگ آتے رہیں گے، آپ سوچ لیں، والد صاحب نے فرمایا آپ کو اگر زحمت ہو تو میں یہاں سے علاحدہ ہو سکتا ہوں؛ لیکن ملک چھوڑ کر کسی قیمت پر نہیں جاؤں گا، مولانا خاموش ہو گئے، والد صاحب نے مشورہ دیا کہ یہ ٹکٹ لے کر آئے ہیں، ایک ذی استعداد شاگرد رشید کی نشاندہی کی، جو کچھ روز فلاح دارین میں تدریس کر چکے تھے کہ انھیں لے جائیں، انھیں ہندوستان نہ چھوڑنا تھا نہ چھوڑا۔

عدم مرعوبیت ان کی ممتاز صفت تھی، جس کا اثر ان کے درس اور بیانات ہی نہیں؛ بلکہ ان کے طرز بود و باش میں بھی چھلکتا رہا، کسی مصنف، مفسر، شارح کی جلالت شان انھیں کبھی عقلی سوالات اٹھانے اور غیر تشفی بخش جوابات پر جرح کرنے سے نہ روک سکتی، وہ ہر ایسے موقع پر پوری قوت سے اعتراض اٹھاتے اور اس کا برسوں تشفی بخش جواب تلاش کرتے، پھر اسے مستفیدین کے سامنے رکھتے، بڑی سے بڑی شخصیات ان کے ساتھ اسٹیج پر جلوہ افروز ہوتیں یا ادارہ میں قدم رنجہ فرما ہوتیں، ان کا ذہن و دماغ کبھی ان کی عبقریت سے مرعوب نہ ہوا اور یہی وجہ تھی کہ جب وہ ایسے جھرمٹ میں اپنی بات کہتے تو ہمیشہ داد تحسین وصول کرتے اور بعد والے ان کے حوالے دیتے رہتے، گجرات میں تقریباً نصف صدی گزارنے کے باوجود ان پر گجراتی زبان یا طرز زندگی کا کوئی اثر نہ ہوا، وہ اپنی اس سادگی، دیوبندی لباس، دلی کی ٹکسالی اردو کے ساتھ رہے، ان کی زبان و قلم کی نفاست کو کوئی چیز متاثر نہ کر سکی؛ بلکہ اس سے بڑھ کر وطن ہی کے کھانے پسند فرماتے تھے، ایک مرتبہ لندن سے واپسی ہوئی، گھر تشریف لائے، والدہ سے فرمایا: ایک روز لندن میں دسترخوان پر کئی قسم کے پر تکلف کھانے رکھے تھے؛ لیکن مجھے وہاں اپنے گھر کے دہی بڑے یاد آ رہے

تھے، اس سے ایک طرف جہاں والدہ محترمہ کی دلجوئی کا اندازہ معلوم ہوتا ہے، وہیں اپنے گھر اور علاقہ کی مطعومات کی پسندیدگی اور اس قسم ہا قسم اور رنگارنگی سے عدم مرعوبیت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

احتیاط

انھوں نے اپنی عملی زندگی کی شروعات ایک اجنبی علاقہ سے کی تھی اور عدم مرعوبیت کی شان پائی تھی، تدریس کے علاوہ اور کئی اشغال اپنے ذمہ لے لئے تھے، اس لئے مہبط اعتراض بن جانا امر فطری تھا، ان کے رفقاء، احباب، معاصرین، سبھی انھیں اپنی دوستانہ و عالمانہ تنقید سے بالاتر نہ رکھ سکے، جس سے محفوظ رہنے کے لئے انھوں نے احتیاط کا اوج کمال تلاش کر لیا تھا، ہر معاملہ میں سب سے پہلی فکر یہی رہتی کہ اس پر کسی سمت سے کوئی تنقید نہ آ سکے، اس خیال نے ان کی شخصیت، مشورہ، فیصلے اور تحریر و تقریر میں غایت درجہ کا استحکام اور نکھار پیدا کر دیا تھا۔

انھیں جب کسی موضوع پر بولنا ہوتا تو اس کے لئے اتنی مضبوط تیاری ہوتی کہ ان کا خطبہ اس موضوع پر شاہ کلید بن جاتا، یہی حال تحریر و درس میں ہوتا، پوری کوشش ہوتی کہ کسی ناقد کے لئے انگلی رکھنے یا گرفت کرنے کی مجال نہ رہے، ان کا فیصلہ بہت محتاط ہوتا، جس میں سکے کے دونوں رخ پیش نظر رہتے، یہی احتیاط جب نوجوان رفقاء کا روضہ کار عمل کے سامنے مشورہ کی شکل میں آتا تو جذبات سے مغلوب نوجوان رفقاء اسے ڈرنے اور خوف کھانے سے تعبیر کرتے؛ جب کہ وہ ڈرنے کی کمال احتیاط ہوتا تھا اور بسا اوقات ان کی رائے کی گہرائی سے صرف نظر کرتے ہوئے فیصلے لے کر نقصانات بھی ہو جاتے۔

ادارہ کے پروگرام تیار کرنے میں بھی یہی احتیاط انتخاب عنوان سے لے کر طالب علم کی اسٹیج سے فراغت تک پیش نظر رہتا کہ کہیں کوئی جھول نہ رہ جائے کہ ہدف تنقید بننے کی نوبت آئے۔

اصابت رائے

اسی غایت احتیاط اور بچ بچ کے چلنے نے انھیں اصابت رائے کے عظیم ملکہ کا حامل بنادیا تھا، ویسے ان کا دل آئینہ کی طرح صاف تھا اور نیت نیک تھی، جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اصابت کے فیضان کے لئے شرط اول ہے اور اس میں شک نہیں کہ جو ادارے مشورہ کی حد تک ان سے متعلق تھے، اس عطیہ الہی سے وہ خوب فیضیاب ہوئے؛ بلکہ جو ان سے متعلق ہوا عام ہو یا خاص، عالم ہو یا غیر عالم، شاگرد ہو یا نہ ہو، جس نے بھی ان کے مشوروں پر عمل کیا، ان کی اصابت رائے سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور آج متعلقین جس متاع گرانمایہ کو گم پارہے ہیں، وہ یہی اصابت رائے ہے کہ اب تک ہر مسئلہ میں ان سے رُجوع ہو کر صحیح رائے پاتے اور عمل کر کے زندگی کے نشیب و فراز میں بے دھڑک گزر جاتے تھے، اب ہماری کشتی کے لئے ناخدا کون ہوگا؟

ہمدردی و نمکساری ان کا خاندانی وصف تھا، جو انھیں اپنے بزرگوں سے بطور میراث عطا ہوا تھا، بچپن کی لیسری، قدر کفاف میں پرورش اور قلندرانہ طرز زندگی، علم انفس میں مہارت اور قدرت کی طرف سے عطا شدہ ”ادراک“ نے اس میں جاذبیت، مٹھاس اور غایت کمال پیدا کر دیا تھا، ان کا یہی وصف تھا کہ جس کے سامنے ان کے ناقد و مخالف بھی جھک جاتے تھے، وہ ہر متعلق و منسلک کے دل میں رہتے تھے اور اس کا دل ٹٹول کر اس کی اندرونی تکالیف کا ادراک و احساس کرتے اور پھر اپنے صحیح مشوروں سے ان کا مداوا فرماتے۔ جو کچھ ممکن ہوتا، اس کو خاموشی سے کر گزرتے، یہی وجہ تھی کہ طلبہ انھیں مسیحا سمجھتے تھے، انتظامیہ کی سرزنش ہو یا اساتذہ کی ناراضگی، وہ اپنا درد ان کے سامنے کھول کر رکھ دیتے تھے، اساتذہ اپنے دل کا حال سنا کر بوجھ ہلکا کرتے، کسی کی ملازمت کی دشواریاں ہوں یا تعلقات کی خرابی، اہل و عیال کی علالت ہو یا سماجی مشکلات، وہ ہر موڑ پر ان کی غم خواری کرتے اور صحیح راہ بتلاتے، دیسی اور گھریلو علاج بتلا کر دُعاؤں سے نواز کر مہنگے علاج سے

بچنے کی راہ دکھلاتے، خانگی مسائل میں ایسے رازدارانہ مشوروں سے نوازتے کہ کسی کا مقام بھی گرنے نہ پائے اور اُلجھن سے آدمی نجات پالے۔ اس کے لئے بسا اوقات بعض بڑے فیصلے لینے کا مشورہ دیتے اور جب مشورہ لینے والا لڑکھڑاتا تو خود اس کا سہارا بنتے۔

نادار طلبہ کی خبر گیری فرماتے، ان کا خفیہ نظم فرماتے، مساجد کے ائمہ و مؤذنین، مکاتب کے اساتذہ، دیہات میں کام کرنے والے حفاظ و علماء خصوصیت سے ان کے ہدایا کے مستحق رہتے، دور رہ کر بھی نادار رشتہ داروں اور متعلقین کے گھروں کے اندرونی حالات — مکان کی تنگی، وسائل کی کمی، امراض کا علاج، بچیوں کی شادیاں حتیٰ کہ سردی کے کپڑے، عید کا سامان تک — باخبر رہتے اور یہ ان کی فکروں میں شامل رہتا، کتنے ہی نادار خاندان اور ان کے گھرانے کے لوگ ایسے تھے کہ ان کے پیر کی چپل کا ناپ بھی ان کے حافظہ میں تھا، اللہ عز و جل اپنے فضل سے اس گھر کے ذریعہ ان سبھی لوگوں کی ضروریات کا دائمی تکفل فرما کر والد صاحبؒ کے ثواب میں دوام عطا فرمائیں۔

احقر نے ”نور“ کے آخری قیام کے دوران ایک مرتبہ عرض کیا کہ حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ پر ہزار ہا مضامین شائع ہوئے، ہر ایک نے اپنے اعتبار سے ان کی خوبیاں بیان کیں، ایک سو کے قریب مضامین احقر نے بھی پڑھے، صرف دو مضامین ایسے تھے، جنہیں دیکھ کر لگا کہ کچھ ترجمانی ہوئی ہے، فوراً متوجہ ہو کر فرمایا: وہ کس کے تھے اور ان میں کیا بات تھی؟

میں نے عرض کیا کہ ایک تو حضرت مولانا انظر شاہ کشمیریؒ کا مضمون تھا، جس میں انھوں نے حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ کو خود تحفظ کی صفت سے مرض کی حد تک متصف قرار دیا تھا اور لکھا تھا ہر فرقہ اور ہر جماعت انھیں اپنا سمجھتی رہی، اور وہ سبھی کی نظروں میں معزز رہے۔

دوسرا مضمون حضرت مولانا ولی رحمانی دامت برکاتہم کا تھا، جس میں انھوں نے لکھا تھا کہ مولانا کی بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ بالواسطہ زبان میں بات کرتے تھے، جس کی وجہ سے وہ موضع اتہام نہ بن سکے، جب مسلم قوم پر فکری یلغار کے ساتھ عملی وار بھی شروع ہو گئے تو حضرت مولانا نے فتویٰ جہاد نہیں دیا؛ بلکہ سیرت سید احمد شہید لکھ کر قوم کے سامنے رکھ دی، جب ہمارے ہی نوجوان اپنی تاریخ سے ناواقفیت کی وجہ سے اپنے بزرگوں، بادشاہوں اور خلفاء کو ہدف تنقید بنانے لگے، دوسروں کی تاریخ پڑھ کر انھیں بہ نظر تحسین دیکھنے لگے، تو مولانا نے ان کے خلاف کوئی محاذ نہیں کھولا، نہ کوئی بیان دیا؛ بلکہ تاریخ دعوت و عزیمت لکھ دی، جب رحمت اللعالمین (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اُمت کو انتہائی بے وقعت؛ بلکہ انسانیت کی پیشانی پر ایک کلنک بنا کر پیش کرنے کی یہودی سازش واشگاف ہوئی تو مولانا کا حساس دل ٹپ گیا؛ لیکن یہاں بھی حضرت مولانا کی بالواسطہ زبان گویا ہوئی اور آپ نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف ”ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین“ لکھی، جب عالم عرب میں تصوف کی جملہ اقسام سے توحش عام ہوا اور برصغیر کی عبقری شخصیات جو اپنی علمی جلالت شان کے ساتھ ساتھ صفت احسان سے متصف اور تصوف کی رمز شناس تھیں ان کی نگاہوں میں مخدوش ہونے لگیں اور عوام کے ساتھ خواص بھی اس میں مبتلا نظر آئے تو مولانا — جو شیخ العرب والعجم تھے — نے نہ کوئی مباحثہ کیا نہ کسی غیر قائل کو قائل کرنے کی کوشش کی؛ بلکہ صفت احسان پر ایک مختصر مگر جامع تصنیف ”ربانیہ لا دہبانیہ“ پیش فرمائی، میں نے جب ان مضامین کا تذکرہ کیا تو آپ نے تحسین فرمائی۔

مجھے معلوم نہ تھا کہ آئندہ والد صاحب کی انھیں صفات کو زینت قرطاس بنانا ہوگا، والد صاحب کو خود تحفظی میں ہم نے اپنی مثال آپ پایا، انھوں نے اپنے آپ کو بچا کر رکھنے کے لئے اپنا سب کچھ تنج دیا، ہر قسم کی قربانی دی؛ لیکن اپنی شخصیت پر کوئی داغ نہ آنے دیا، ان کے رب حقیقی نے بھی ان کی لاج رکھی اور وہ اپنی محفوظ، ہر دلعزیز، محبوب خاص عام اور اپنے

پرائے میں مقبول، نیز سب کی نظروں میں معزز شخصیت لے کر اس دنیا سے کوچ کر گئے۔ دوسری صفت ان کا بالواسطہ عمل تھا، وہ ہمیشہ اپنے آپ کو پس منظر میں رکھ کر کام کرنے کے عادی تھے، وہ کبھی فلاح دارین کے مہتمم نہیں رہے اور ناظم تعلیم رہتے ہوئے بھی شاذ و نادر ہی انھوں نے کسی کاغذ پر بحیثیت ناظم دستخط کئے ہوں؛ لیکن پس منظر میں رہ کر ادارہ کو ملک کا معزز ادارہ بنانے میں کار نمایاں انجام دیا۔

انھوں نے کبھی نہ کوئی مدرسہ کھولا، نہ مسجد بنوائی؛ لیکن ایسے عوامی نمائندے تلاش کئے جو مقامی علماء کے ساتھ رہ کر مدارس چلا سکتے تھے، انھیں تقویت دی، حوصلہ بخشا، ہر موڑ پر انھیں ہر قسم کے تعاون کے ساتھ عوام میں مقبولیت دلائی، جامعہ اسلامیہ بنجاری مہو، اندور، جامعہ مختار العلوم سیر پور بانک، اندور، جامعہ ابن عباس گنا، مدرسہ اسلامیہ آرون وغیرہ بہتیرے مدارس و جامعات اور ان کے کارکنان اس کی زندہ مثالیں ہیں۔

قرآن پاک کی تعلیم کے لئے خود کوئی نظم نہیں کیا؛ لیکن خادم قرآن حضرت مولانا غلام محمد وستانوی مدظلہ کی بھرپور تائید کی، ان کی قرآنی تحریک کو منطقی دلائل اور ذہنی، فکری، فقہی معاونت دی، قرآن پاک کی نسبت پر تجوید کی ترویج و اشاعت، مکاتیب کا قیام، حفظ قرآن پاک کی طرف عوامی رجوع پیدا کرنے کے لئے ان کے ہر اجلاس میں دور دراز کا سفر فرما کر شرکت کرتے اور اجلاس میں مولانا وستانوی اور ان کی تحریک کی بھرپور وکالت فرماتے، فضائل سناتے، مساجد کے سنگ بنیاد اور افتتاح کے لئے دور دور کے اسفار کرتے، خود کبھی چندہ نہیں کیا؛ لیکن مکاتیب، مدارس اور مساجد کے قیام کے لئے عوام اور ارباب ثروت کی ایسی ذہن سازی کرتے کہ وہ ہمیشہ کے لئے ان سے وابستہ ہو کر رہ جاتے، کتنے ہی اداروں کو انھوں نے مخلص معاونین عنایت کئے اور اس کے علاوہ وہ بہت سے بالواسطہ کارہائے خیر تھے، جن کا تذکرہ ان کی وفات حسرت آیات کے فوراً بعد مناسب نہیں، کوئی نہیں جانتا تھا کہ ان کاموں کے پیچھے ان کی شخصیت کا فرما تھی، رب کریم اپنے خفیہ انعامات سے انھیں سرفراز فرمائیں۔

کسر نفسی

ہر آدمی میں کوئی وصف ایسا ہوتا ہے جو اسے اپنے رفقاء و معاصرین میں ممتاز کرتا ہے، والد صاحب کی پاکیزہ اور محبت و محبوبیت سے لبریز زندگی میں امتیازی وصف ان کی کسر نفسی تھی، انھوں نے کسر نفسی میں اپنی علمی و روحانی جلالت شان کو ایسا چھپایا تھا کہ ان کی ذات عالی و قارتک اکثر لوگوں کی نگاہ نہ پہنچ سکی، یہی صفت تھی جس کی وجہ سے ۴۵ سال ایک مقام پر رہنے کے باوجود کبھی کسی سے گرم گفتگو نہ ہوئی، نہ زندگی میں کوئی عزت نفس کا مسئلہ بن سکا، عجیب شان یہ تھی کہ جو ان کے خلاف ہوتا یا درپے آزار ہوتا، ان کی شفقت محبت اور ہمدردی اس کے ساتھ اور بڑھ جاتی، ہر منفی سے وہ کوئی مثبت پہلو ضرور نکال لیتے تھے۔

حضرت مولانا علی میاں صاحب کے باب میں کسی نے حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو لکھا تھا کہ مجھ سے حضرت مولانا کی شان میں گستاخی ہوگئی ہے، اپنے دینی و اخروی برے انجام سے ڈرتا ہوں، حضرت شیخ نے جواب میں لکھا کہ تم نے گستاخی بھی مولانا علی میاں کی شان میں کی ہے، جو عفو و درگزر کے دریائے ناپیدا کنار ہیں، حضرت والد صاحب کے متعلقین نے عفو و درگزر کے اس دریا سے بارہا سیرابی کی ہوگی؛ لیکن نہ ساقی کی پیشانی پر بل دیکھا، نہ جام و مینا میں بال آیا، نہ اپنی ذات کے لئے کوئی مطالبہ کیا نہ محرومی پر افسوس؛ بلکہ کسر نفسی کی اس شان نے انھیں دوسروں کو عزت دلانے والا حسن بنادیا تھا، انھوں نے اپنے ناقدین پر اس طرح بھی فتح پائی تھی کہ وہ ان کی بھی عزت افزائی کرتے اور اپنا مقام تہج کر انھیں مقام دلاتے۔

حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی دامت برکاتہم فرماتے ہیں، کہ ہم نے مولانا جیسا خور دنوا نہیں دیکھا وہ اپنے چھوٹوں کی دل کھول کر تعریف کرتے، ان کی عزت افزائی کرتے، انھیں بڑا بنانے اور عوام میں ان کی مقبولیت سے بہت خوش ہوتے؛ چوں کہ اپنی

شخصیت انھوں نے تہج رکھی تھی، اس لئے ہر خاص و عام کی دلداری فرماتے، کوئی اپنی بات کہتا مگر وہ حق سے نہ ٹکراتی تو آپ اس کی ایسی تائید فرماتے اور بھرپور وکالت کرتے کہ خود قائل دنگ رہ جاتا، چھوٹا بچہ ہو، بوڑھی عورت ہو، طالب علم ہو، شاگرد ہو، یا جلیل القدر معاصر، سبھی کی دلداری کر کے ان کا دل موہ لینا اور سب کی سب کچھ برداشت کر لینا یہ ان ہی کا طرہ امتیاز تھا۔

اسی وصف ممتاز نے انھیں انتہائی سادہ مزاج، صابر و قانع، مہمان نواز، جو ہر شناس، عفو و صفح کا پہاڑ، سب کا محسن اور امت کی خدمت میں فداکار بنا دیا تھا، ہر ایک سے تفصیلی گفتگو کر کے اس کی زندگی کے واقعات معلوم کرنا اور پھر ان سے سبق آموز نتیجہ نکالنا، احادیث طیبہ اور آیات قرآنی کا ان پر انطباق کر کے اسلام سمجھنا اور سمجھانا ان کا وہی ملکہ تھا اور ان کے علاوہ دسیوں ایسے خصائص ہیں، جنہیں اگر تفصیل سے لکھا جائے تو ایک کتاب زندگی تیار ہو جائے۔

ان سب کے ساتھ ساتھ ان کا تعلق مع اللہ شب بیداری، راتوں میں دودو گھنٹے مسلسل مناجات و دعاء، توجہ الی اللہ، ہر عمل میں صرف اللہ کو راضی کرنے کا خیال، اللہ تعالیٰ کے علاوہ اس کائنات میں اپنا کوئی مونس و غم خوار نہیں، مأوی و ملجأ نہیں، اس کا یقین، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ناز بھری محبت، یہ سب وہ چیزیں تھیں، جو انھیں محبوبیت عطا کرنے والے اللہ کی بارگاہ میں مقبول بنا رہی تھیں، بے نفسی کے ساتھ مسلسل جہد و عمل، خدمت دین، تفہیم شریعت، درس و وعظ، ہمدردی و غم خواری، اپنے مولیٰ کی رضا کے لئے راتوں کی عبادت سے تھکے ہوئے اور بیماریوں سے چور راہ زندگی کے اس مسافر پر جب رحمت ربانی کو ترس آیا تو اچانک محبین کے جھرمٹ سے اچک کر اسے اپنے مہمان خانہ میں آسودہ خواب کر دیا، بارالہا! آپ کے نبی برحق کا فرمانبردار نواسہ آپ کے حضور حاضر ہے، ان کی جفا کشی، نفس کشی، انسانیت نوازی، خدا پرستی اور اشاعت دین نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی محنتوں کا

بہترین صلہ نصیب فرما اور انھیں اپنی رحمت کا وہ جوار نصیب فرما، جو نانا جان کے وفا شعار نواسوں کے لئے آپ نے مخصوص فرما رکھا ہے۔

ایں دُعاء از من و از جملہ جہاں آمین باد
اور ان کے جملہ متعلقین و محبین کے لئے ان کے ساتھ تعلق اور محبت کو ذخیرہ آخرت

بنادے۔

سالوں سال یہ دھرتی تیری فرقت پے روئے گی
بڑی مشکل سے ہوگا دھر میں تجھ سا بشر پیدا

